تذکرۂ عزیز

اوّل مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کے حالات

افادات

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

ترتیب

ندیم احمد انصاری

ڈیریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا

تذکرۂ عزیز

اول مفتیِ اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانی صاحبؒ کے حالات

افادات

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

مرتب وناشر

مولانا ندیم احمد انصاری

ایم اے، ایم فل، جرنسلٹ

روم نمبر:14، پہلی منزل، 42-B، مدبر نگر

نوپاڑہ، باندرہ(مشرق)، ممبئی:51

صفحات: 48

اشاعت: اول(دسمبر2019ء)

آئی ایس بی این: 978-93-5396-432-0

Tazkira e Aziz

Awwal Mufti e Azam Darul Uloom Deoband Mufti Azizurrahman Usmani rh. sb. ke Halaat

Ifadaat

Hazrat Maulana Qari Muhammad Tayyib sb. rh.

Editor / Publisher

Maulana Nadeem Ahmed Ansari

M.A, M.Phil, Journalist

Room No. 14, First Floor, 42-B, Mudabbir Nagar,

Naupada, Bandra (e), Mumbai-51

Pages : 48

Edition : First (December 2019)

ISBN : 978-93-5396-432-0

انتساب

دارالعلوم دیوبند
کے ان اکابرین کے نام
جنھوں نے اپنے علم وعمل سے
بے شمار مسلمانوں کی زندگیوں کو روشن کیا۔

ندیم احمد انصاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرس

❑❑❑❑

دعائیہ کلمات

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

سابق صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

دارالعلوم دیوبند ملتِ اسلامیہ کا وہ محسن ادارہ ہے کہ جس نے اپنے عہدِ آغاز سے ملتِ اسلامیہ کی دینی زندگی میں رہنمائی انتہائی کامیاب انداز میں کی ہے۔ دینِ فطرت اسلام ایک کلمہ گو کو اسی کا عادی بنانا چاہتا ہے کہ ایک مسلم اپنے اعمال میں ذاتی خواہش کی تکمیل کے بجائے دینی اہتمام کو ملحوظ رکھ کر اپنے جملہ اعمال کو دینی تعلیمات میں ڈھال لے۔ اس عادتِ مبارکہ کا حاصل یہ ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے اعمال دینی شعور میں ڈھل کر نہ صرف عامل کے لیے بلکہ اس کے اعمال پر نگاہ رکھنے والوں کے لیے بھی وسیلۂ ہدایت بن جاتے ہیں۔

حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مفتیِ اول دارالعلوم دیوبند کی شخصیت اور ان کے حالات وواقعات کو (حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں تحریر کیا تھا، جسے جدید ترتیب اور مفید اضافوں کے ساتھ) جناب ندیم احمد انصاری صاحب نے قلم بند کیا ہے۔ حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کتاب کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور آنے والی نسلوں کو اس سے استفادے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین

(مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب)

صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

DARUL ULOOM (WAQF) DEOBAND - 247554 (U.P.) INDIA

Ref. No. ....

Dated ....
۱۴/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۸ھ

دارالعلوم دیوبند ملت اسلامیہ کا وہ محسن ادارہ ہے کہ جس نے اپنے عہد آغاز سے ملت اسلامیہ کی دینی زندگی کی دینی رہنمائی و اصلاح کامیاب انداز پر کی ہے،
دینی فطرت اسلام دین کلی کو اس کا عادی بنانا چاہتا ہے کہ ایک مسلم اپنے اعمال میں ذاتی خواہشات کی تکمیل کے بجائے دینی احکام کو ملحوظ رکھ کر اپنے جملہ اعمال کو دینی تعلیمات میں ڈھال لے۔ اس عادت مبارکہ کا حاصل یہ ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا ہر چھوٹا اور بڑا عمل دینی شعور میں ڈھل کر نہ صرف عامل کے لئے بلکہ اس کے اعمال پر نگاہ رکھنے والوں کے لئے بھی وسیع ہدایت بن جاتی ہے۔
مفتی عزیز الرحمن صاحب مفتی اول دارالعلوم دیوبند کی شخصیت اور ان کے حالات و واقعات کو جناب ندیم احمد انصاری صاحب نے قلمبند کیا ہے، حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کتاب کو قبولیت ارزانی فرمائے۔ آنے والی نسلوں کو اس سے استفادہ کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین!

(مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب)
صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند۔

تمہید

الحمد للہ و کفیٰ و سلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، امابعد:

مفتیِ اعظم ہند اور مفتیِ اوّل دارالعلوم دیوبند کے حالات پر ان کوتاہ نظروں سے کوئی مستقل کتاب اب تک نہیں گزری، جب کہ حضرت ممدوح کی ذات ایسی نہیں جسے فراموش کیا جا سکے۔ آپ کے علمی احسانات کا بارِ گراں لاتعداد حق پرستوں کے کندھوں پر ہے۔ حضرت ممدوح کے شاگردِ رشید حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے استاذِ محترم کے حالات کو 'فتاویٰ دارالعلوم دیوبند' کی جلد اوّل میں عقیدت و خوبی سے بیان کیا اور آخر میں یہ لکھ کر ہم جیسوں کو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کی اجازت مرحمت فرما دی:

> یہ چند واقعات جو قلم اٹھا کر بے ساختگی سے لکھ دیے گئے ہیں، نہ سوانح ہیں، نہ تاریخ، صرف ایک تذکرے کی حیثیت رکھتے ہیں، جو دلوں کی تسلّی کے طور پر سپردِ قلم کر دیے گئے ہیں۔ خدا کرے کوئی باخبر اور باہمت ان پر اضافہ کر کے اس شیریں ذِکر کو اور ذرا طویل کر دے کہ ذکرِ محبوبانِ الٰہی خود محبوب اور شکر فشاں ہوتا ہے۔

اس لیے ہم نے یہ سوچ کر کہ اول تو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جیسی ضخیم کتاب کم لوگوں کے پاس موجود رہتی ہے، دوسرے فی زمانہ طویل و ضخیم کتابوں کے مطالعے سے طبیعتیں وحشت محسوس کرنے لگی ہیں، حضرت قاری صاحبؒ کے ارشاد 'باخبر و باہمت' کے وقیع الفاظ کے باوجود جسارت کرتے ہوئے مختلف مقامات سے چند اضافوں کے ساتھ یہ حالات و

واقعات اہلِ دل تک پہنچانے کی غرض سے جدید انداز میں مرتّب کر دیے۔ اور تحریر و املا کے جدید اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کتاب کی کمپیوٹر کتابت کرائی گئی۔ امید ہے کہ باذوق قارئین اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ ان شاء اللہ

جدید ترتیب میں 'تاریخِ دارالعلوم دیوبند مصنفہ مولانا سید محبوب رضوی'، 'عزیز الفتاویٰ مرتبہ مفتی محمد شفیع عثمانی'، 'روح القرآن مرتبہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی'، 'تفسیرِ عثمانی مرتبہ مولانا ولی رازی' اور 'تذکرہ وسوانح علامہ شبیر احمد عثمانی مدیر مولانا عبدالقیوم حقانی' وغیرہ سے چیدہ چیدہ اقتباسات لیے گئے اور ان کا حوالہ مع جلد وصفحات لکھ دیا گیا ہے۔ جہاں کہیں حوالہ مذکور نہیں وہ حضرت قاری صاحبؒ کے افادات ہیں۔ ضرورت کی بنا پر بعض مقامات پر کچھ اضافے کی نوبت آئی ہے، اسے اس طرح کے قوسین [ ] میں لکھ کر اصل تحریر سے ممتاز کر دیا گیا ہے۔

ایک اور بات جس کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ نے جس زمانے میں یہ تحریر سپردِ قلم کی تھی، اس وقت ایسے بہت سے حضرات بہ قیدِ حیات تھے، جن کا سلسلۂ کلام میں ذکر آیا ہے، ان کے نام کے ساتھ لکھے گئے دعائیہ جملے کو ترمیم کر کے مطابقِ حال بنا دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں بزرگانِ دین کی زندگیوں سے سبق حاصل کرنے والا بنائے اور اس مختصر خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین

ندیم احمد انصاری

خادم الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا

۱۳ر صفر ۱۴۳۸ھ

خاندان وسلسلۂ نسب

مولانا فضل الرحمن -حضرت مفتیِ اعظم کے والدِ گرامی- دیوبند کے ایک پرانے اور معروف عثمانی خاندان دیوان لطف اللہ کی اولاد میں تھے۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے: مولانا فضل الرحمن، بن داؤد، بن غلام محمد، بن غلام نبی۔[1] آپ کا شجرۂ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بیالیسویں پشت میں ملتا ہے۔[2]

حضرت مولانا فضل الرحمن عثمانیؒ نے دہلی کالج میں حضرت مولانا مملوک علیؒ سے تعلیم پائی تھی۔ دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے۔ مجلسِ شوریٰ کے آخر تک رکن رہے۔ فارسی واردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ متعدد نظمیں، قصیدے اور مرثیے وغیرہ ان کے ذوقِ شعری کے آئینہ دار ہیں۔۔۔ محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز تھے۔ بریلی، بجنور اور سہارنپور وغیرہ اضلاع میں تعینات رہے۔ 1325ھ بمطابق 1907ء میں رحلت فرمائی۔ انھوں نے اپنے بعد اپنے فرزندوں میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی (مفتیِ اعظم دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور مولانا شبیر احمد عثمانی (صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند) جیسے مشاہیر اور یگانۂ روزگار علما چھوڑے۔ ندوۃ المصنفین، دہلی کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی اُنھیں کے پوتے ہیں۔ حضرت مولانا فضل الرحمن عثمانیؒ کے اخلاف نے عظیم علمی اور دینی خدمات انجام دی ہیں، جن کا سلسلہ بحمداللہ اب تک جاری ہے۔[3]

مولانا فضل الرحمن عثمانی نے تین نکاح کیے؛ پہلی بیوی سے اولاد نہ ہوئی۔ دوسری اور تیسری بیوی سے اولاد ہوئی۔ دوسری بیوی سے مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، مولانا حبیب الرحمن عثمانی اور حافظ خلیل الرحمن عثمانی پیدا ہوئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی تیسری بیوی سے تھے۔[4]

مختصر یہ کہ حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانی صاحب رحمہ اللہ دیوبند کے عثمانی شیوخ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفِ اکبر ہیں، جو دارالعلوم دیوبند کے اولین اساطینِ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کے طبقۂ اولیٰ کے اراکین اور حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند کے مخصوص مجلس نشین احباب میں سے تھے۔ نیز حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتممِ سادس دارالعلوم دیوبند کے حقیقی برادرِ کلاں اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاتی بھائی ہوتے ہیں۔ حضرت کا سنِ ولادت 1275ھ [1859ء] اور تاریخی نام 'ظفر الدین' ہے۔

حضرت مفتیِ اعظم قدس سرہ نے 1298ھ میں تمام علوم وفنون سے فراغت حاصل کر کے درس وتدریس کے سلسلے میں میرٹھ میں قیام فرمایا اور عرصۂ دراز تک تعلیمی مشاغل کے ساتھ وہاں مقیم رہے۔ چوں کہ آپ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، مہتممِ ثانی دارالعلوم دیوبند کے اجل خُلفا میں سے تھے، اس لیے میرٹھ کے تدریسی قیام کے دوران میں بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہا اور کتنے ہی سعید الارواح آپ کے انفاسِ طیبہ سے مستفید ہو کر اپنی مراد کو پہنچے۔ 1309ھ میں آپ کو میرٹھ سے دار

العلوم میں بلایا گیا اور آپ نیابتِ اہتمام کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مہتمم کی عدم موجودگی اور غیبت کے زمانے میں آپ ہی اہتمام کے اختیارات استعمال فرماتے تھے۔

حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے آپؒ کی تعلیمی و تدریسی تفصیلات کے ضمن میں لکھا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے تیسرے سال یعنی 1285ھ میں یہ -ہونے والے مفتیِ اعظم- دارالعلوم کے درجۂ حفظِ قرآن میں داخل ہوئے اور 1297ھ تک تیرہ سال میں حفظِ قرآن سے لے کر تمام علومِ عربیہ کی پوری تکمیل فرمائی۔ جلسۂ دستار بندی منعقدہ 17 شوال 1298ھ میں جو مدرسے کے نوتعمیر مکان میں سب سے پہلا جلسہ تھا، قطبِ عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ اور دیگر اکابر کے ہاتھوں آپ کو سند اور دستارِ فضیلت دی گئی۔ 1299ھ میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں بلا تنخواہ تعلیم و تدریس کا کام شروع کیا، 1300ھ سے 1309ھ تک دیوبند میں قیام نہیں رہا، یہ عرصہ کچھ تو شہر میرٹھ کے مدرسہ اسلامیہ کی تدریس میں اور کچھ اپنے شیخ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر مقاماتِ سلوک و تصوف طے کرنے میں گزرا۔[5]

بعض کتب میں یوں مرقوم ہے کہ حضرت مفتیِ اعظم کی دینی تعلیم کا آغاز حفظِ قرآن مجید سے ہوا۔ دارالعلوم دیوبند سے جملہ علومِ اسلامیہ میں تحصیل کی۔ 1295ھ مطابق 1878ء میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ فراغتِ تعلیم کے بعد کچھ عرصے دارالعلوم میں معین المدرس رہے اور اس کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمات بھی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نگرانی میں انجام دیتے رہے، اس کے بعد آپ مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ (میرٹھ) چلے گئے اور کئی سال تک اس مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دیں۔[6]

عہدۂ افتا کے لیے نامزدگی

1310ھ میں حضرت قطبِ عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ، سرپرست ثانی دارالعلوم دیوبند کی تجویز سے دارالافتا کے لیے باضابطہ عہدۂ افتا تجویز ہوا اور حضرت اقدس نے اپنی فراستِ باطنی سے وہ تمام جوہر- جو ایک ذمّے دار مفتی میں درکار ہیں- حضرت مفتیِ اعظم میں دیکھ کر عہدۂ افتا کے لیے نامزد فرمایا۔ اس لیے حضرت مفتیِ اعظم دارالعلوم کے مفتی ہی نہیں بلکہ یہاں کے عہدۂ افتا کا نقطۂ اولیٰ بھی ہیں، جس کا آغاز ہی حضرت ممدوح کی ذاتِ گرامی سے کیا گیا ہے، اور آپ یہاں کے قصرِ افتا کے لیے خشتِ اول ثابت ہوئے، جس پر آگے کی تعمیر کھڑی ہوئی۔

اس سے پہلے دارالعلوم میں فتویٰ نویسی کے لیے کوئی مستقل عالم مقرر نہ تھے بلکہ حضراتِ مدرسین بہ طورِ خود، آنے والے سوالات کا جواب دے دیا کرتے تھے اور زیادہ تر فتاویٰ کا کام دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس، جامع کمالاتِ ظاہری اور باطنی، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ انجام دیتے تھے۔[7]

افتا میں مہارت

شدہ شدہ آپ کی افتائی مہارت اس حد تک پہنچی کہ بڑے سے بڑا مسئلہ اور معرکۃ الآرا استفتا کا جواب قلم برداشتہ اور بلا مراجعتِ کتب بے تکلّف سفر و حضر میں تحریر فرما دیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے اہم فتاویٰ جن کو مرتب کرنے میں اگر آج کے مفتی اور ماہر علما مشغول ہوں تو مراجعتِ کتب کے بعد بھی شاید دنوں اور ہفتوں کی سوچ و چار کے بعد بھی

فتوے کا وہ سہل عنوان اختیار نہ کر سکیں گے، جو حضرت ممدوح قلم برداشتہ اس طرح بے تکلف لکھ جاتے تھے جیسے روزمرہ کی معمولی باتیں ڈایری میں لکھ دی جاتی ہیں۔ چالیس سال آپ نے دارالعلوم کے دارالافتا کی خدماتِ جلیلہ انجام دیں اور اس دور میں سیکڑوں ہی ایسے اہم اور مشکل فتاویٰ بھی سپردِ قلم فرمائے جو نہ صرف فتویٰ بلکہ معرکۃ الآرا مہمات میں محاکمے کی حیثیت رکھتے تھے اور صرف چند لفظوں میں کوئی مسئلہ جب عقدۂ لاینحل ہو جاتا تھا اور علماے وقت آپ کی طرف رجوع فرماتے تھے تو آپ کا جواب آپ کی خداداد علمی بصیرت اور تفقہ فی الدین کے سبب قاطعِ شکوک وشبہات ہوتا تھا، بلکہ عموماً ایسے مسائل میں آپ کا اسمِ گرامی سامنے آجانا ہی علماے عصر کے لیے تسلّی وطمانیت کا باعث ہو جاتا تھا۔

سفر وحضر میں استفتا کا بڑا ذخیرہ ساتھ رہتا تھا اور عام حالات میں بغیر مراجعتِ کتب، محض حذاقت ومہارت اور کمالِ استعداد سے بے تکلف فتویٰ ثبت فرماتے اور نصوصِ فقہیہ اکثر وبیش تر حفظ یادداشت سے تحریر فرماتے تھے، جن میں فرق نہیں نکلتا تھا۔ حتیٰ کہ آخر میں خود ہی بہ نفسِ نفیس کتابِ ناطق بن گئے تھے۔ افتائی حکم نہایت جچا تلا، حشو وزوائد سے پاک، وجیز، مختصر اور جامع ہوتا تھا۔ جس کا شاہدِ عدل وہ ذخیرۂ فتاویٰ ہے جس کا ایک حصہ بہت پہلے مولانا محمد شفیع صاحب، مفتیِ پاکستان نے ’عزیز الفتاویٰ‘ کے نام سے شائع فرمایا تھا۔ مگر اس طرح کہ کچھ حصّے مرتب تھے اور کچھ غیر مرتب، پھر تصحیح جس پیمانے پر ہونی چاہیے تھی، نہ ہو سکی تھی۔ اصل ذخیرہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتا میں محفوظ ہے، جسے از سرِ نو دارالعلوم کے ایک پورے عملے کے ذریعے مرتب کرایا جا رہا ہے [اور یہ سلسلہ اب مکمل ہو چکا ہے] جو حضرت ممدوح کی باقیاتِ صالحات ہیں اور جریدۂ عالم پر رہتی دنیا تک ثبت رہیں

گی۔ لاکھوں افراد نے ان فتاویٰ پر چل کر اپنی عاقبت درست کی اور لاکھوں سعید الارواح ہوں گے جو اپنی عاقبت کو سنواریں گے اور یہ غیر منقطع صدقۂ جاریہ چلتا رہے گا۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کو حق تعالیٰ نے اس کام کے لیے چن لیا تھا۔ 1310ھ سے جو خدمت شروع فرمائی تھی تو شب و روز کا ایک مشغلہ بن گیا تھا کہ جب یہ روحِ مقدس رفیقِ اعلیٰ سے ملنے والی تھی، اس وقت یہ مشغلہ تمام ہوا۔ وفات سے کچھ پہلے بھی ایک فتویٰ ہاتھ میں تھا، جس کو موت ہی نے ہاتھ سے چھڑا کر سینے پر ڈال دیا تھا۔[8]

بیعت وارشاد

حضرت ممدوں نہ صرف عالم اور مفتی ہی تھے بلکہ عارف باللہ اور صاحبِ باطن اکابر میں سے تھے۔ بیعت و ارشاد کا سلسلہ مستقلاً قائم تھا اور ہزار ہا بندگانِ خدا اطرافِ ہندوستان میں آپ کی باطنی تلقین وتربیت سے فیض یاب ہو کر مراد کو پہنچے اور یہ سلسلہ دور دور تک پھیلا۔ آپ حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہ، مہتمِ ثانی دارالعلوم دیوبند کے ارشد خُلفا میں سے تھے اور سلسلۂ نقشبندیہ کے نہایت ہی صاحبِ حال اور ممتاز مشائخ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ میرٹھ میں حضرت ممدوح کے سلسلے کا ایک بہت بڑا حلقہ تھا۔ حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے خلفاے مجازین میں سے تھے۔ قاری صاحب ممدوح کے مجاز وخُلفا میں سے اول نمبر کی شخصیت فاضلِ یگانہ حضرت مولانا بدرِ عالم میرٹھی مہاجر مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ المختصر! حضرت مفتیِ اعظم کا سلسلۂ فیض ہندوستان اور پاکستان سے گزر کر حجاز میں بھی پھیلا۔۔۔ نقشبندیت کے مشہور معمولات میں سے ختمِ خواجگان ہے، جو حضرت مفتی صاحب کی مسجد میں (جو دیوبند میں چھوٹی مسجد کے نام سے مشہور ہے) پابندی کے ساتھ روزانہ صبح کی نماز کے بعد ہوتا تھا۔

تواضع اور خدمتِ خلق

علم وعمل کے ساتھ تواضع و کسر نفسی، اپنے کو چھپانا اور مٹانا آپ کا خاص رنگ تھا، جو چھوٹی چھوٹی جزئیات تک میں نمایاں ہوتا تھا۔ روزانہ کا معمول تھا کہ بعد نمازِ عصر محلّے کے آس پاس کے گھروں کے دروازوں پر جا کر پوچھتے کہ بازار سے کسی کو کچھ سودا منگانا ہو تو بتلا دے۔ گھروں سے آواز آتی مفتی جی! چار پیسے کی مرچیں لا دو! کہیں سے آواز آتی تیل چاہیے! کسی گھر سے کہا جاتا کہ نمک درکار ہے! حضرت ممدوح سب کے پیسے لے لیتے اور بازار جا کر ایک ایک کا فرمائشی سودا خریدتے۔ کسی کا نمک، کسی کی مرچ، کسی کا دھنیا۔ اور یہ سب سامان رومال کے الگ الگ کونوں میں باندھ کر خود ہی لاتے۔ یہ کبھی گوارا نہ فرماتے کہ اس بوجھ کو کوئی بٹوائے۔ خود ہی یہ سامان اپنے کندھوں پر لادتے۔ بعض اوقات بوجھ سے دہرے ہو جاتے تھے، مگر کسی حالت میں گوارا نہ تھا کہ اسے دوسرے کے حوالے فرما کر کچھ ہلکے ہو جائیں۔ پھر خود ہی گھر گھر جا کر یہ اشیا فرمائش کنندوں کے سپرد فرماتے۔

بےنفسی اور خدمتِ خلق کے مدعی ہزاروں نظر آئیں گے، لیکن عمل اور وہ بھی جزیاتی عمل، جس میں شو اور نمود کا نشان نہ ہو، کوئی جواں مرد ہو تو دکھلائے، لیکن خود ان کے پاس نفس میں اس کا تصور بھی نہ تھا کہ میں کوئی خدمت کر رہا ہوں یا کوئی بڑا عمل ہے جو میرے ہاتھوں انجام پا رہا ہے، یا میں کسر نفسی کا کوئی عظیم کارنامہ انجام دے رہا ہوں۔

پڑوسیوں کا تعاون

برسات میں بارہا دیکھا گیا کہ محلّے کے مکانوں کی چھت ٹپکی اور محلّے دار بیبیوں

نے کہلا بھیجا کہ ’مفتی جی ذرا ہماری چھت دیکھ لو، بہت ٹپک رہی ہے!‘ یہ سنتے ہی حضرت اقدس لنگی باندھ کر بارش میں نکل کھڑے ہوتے اور محلّے والوں کے مکانات کی چھتوں پر بارش میں مٹی ڈالنے کی خدمت انتہائی ذوق وشوق اور دردمندی کے ساتھ انجام دینا شروع فرما دیتے۔

بے نفسی کا ایک واقعہ

حضرت مفتیِ اعظم کے مکان سے ملے ہوئے مکان میں ایک بڑی بوڑھی مقیم تھیں جنھیں سب ’امّاں خوبی‘ کہا کرتے تھے۔ عمر میں حضرت ممدوح سے بہت بڑی تھیں۔ انھوں نے ایک دن کہا ’عزیز الرحمن مکان کی چھت بہت خراب ہوگئی ہے، بارش میں اتنا ٹپکا لگا ہے کہ رات بھر ٹپکتے گذر گئی ہے، مٹی ڈلوانے کا کوئی بندوبست کرادو‘ فرمایا کہ بہت اچھا۔ چناں چہ مٹی منگوائی اور ان کے گھر میں ڈھیر کرادی۔ اُس پر کہنے لگیں کہ عزیز الرحمن مٹی تو آگئی، مزدور کوئی نہیں کہ اسے چھت پر ڈلوادوں۔ فرمایا: امّاں اس کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔ اس بارش میں لنگی باندھ کر خود چھت پر چڑھے اور خود ہی چھت پر مٹی ڈالنی شروع فرمائی۔ بارش میں بھیگتے ہوئے مٹی ڈالنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بخار آیا۔ سخت تکلیف اٹھائی، مگر اس بوڑھی امّاں پر واضح نہ ہونے دیا کہ اس مٹی ڈالنے میں کون سے مزدور نے کام کیا اور اس محنت سے اس پر کیا گزری؟

عظمت وللہیت

کسی نمایاں مقام پر کسی اونچی خدمت کا انجام دے دینا آسان کام ہے کہ اس میں مدحِ خلائق اور ناموری کے مواقع ممکن ہوتے ہیں، لیکن یہ گم نام خدمات اور وہ بھی ویسے

چھوٹے درجے کی کہ بڑائی پسند کبھی اس خدمت کے آس پاس بھی نہیں پھٹک سکتا، بلکہ اسے اپنے وقار اور منصب کے خلاف سمجھتا ہے اور تحقیر کے ساتھ ردّ کر دینا ہی اپنی شان سمجھتا ہے انجام دینا کوئی آسان کام نہیں، مگر حضرت اقدس اسے کیسی للّٰہیت، کیسے شغف اور کیسی دردمندی سے انجام دیتے تھے کہ اسے آنکھیں زیادہ محسوس نہیں کرسکتیں۔ دل محسوس کریں گے کہ اس کی کیا نوعیت تھی؟ یہ خدمت نہیں تھی، مجاہدۂ عظیم تھا، جسے عُظما ہی انجام دے سکتے ہیں، ہر ایک کا حوصلہ نہیں ہے کہ ان خدمات کے قریب بھی آسکے۔

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمانۂ خلافت میں رعایا کے گھروں میں مشکیزہ اٹھا کر پانی تک بھر آتے تھے اور گم نام بوڑھیوں کے گھروں پر پہنچ کر ان کا کھانا تک پکا آتے تھے تو ان کے اس نقشِ قدم پر چلنا ہر ایک کا کام نہیں، یہ مفتیِ اعظم جیسی ہی بے نفس ہستیوں کا مقام تھا کہ خدمتِ خلق کے اس جذبے سے سرفراز ہوں اور انھیں کا حوصلہ اور نصیب تھا کہ وہ ان پاکیزہ اعمال کے لیے منتخب کیے گئے۔ جماعتِ دارالعلوم میں آپ کی انکساری اور کسرِ نفسی کے یہ کارنامے سب کے نزدیک امتیازی شان رکھتے تھے۔ یہ شانِ بے ریائی اور تواضع کی یہ بے مثال عملی صورتیں دائرۂ دارالعلوم میں آپ ہی کی ذات کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی تھی، جن کو یہاں کے تمام اکابر عظمت و وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان خدمات کو انھیں کا حصہ سمجھتے تھے۔

درس وتدریس

ان عملی مجاہدات کے ساتھ علمی باریک بینیاں مستزاد تھیں۔ افتا کے ساتھ درس کا شغل مستقل رہتا تھا۔ فقہ وحدیث اور تفسیر کے اونچے اسباق آپ کے یہاں ہوتے تھے۔

بڑی بڑی باریک تحقیقات جو آپ کے ذہنِ رسا کی پیداوار ہوتی تھیں کبھی بھی اپنی طرف منسوب کر کے دعوے کے رنگ میں [پیش] نہیں فرماتے تھے بلکہ بہ طور احتمال کے ارشاد فرماتے اور تقریر کے ضمن میں کہتے کہ اس مسئلے میں ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے' حالاں کہ وہ ان کی تحقیق ہوتی تھی، مگر کبھی بھی یوں نہیں فرماتے تھے کہ اس مسئلے میں میری رائے اور تحقیق یہ ہے۔

غور کیا جائے تو یہ مقام اس علمی خدمت اور عملی بے نفسی کے مقام سے بھی زیادہ بلند اور نازک تر ہے، جس تک پہنچنا ہر ایک کا حوصلہ نہیں۔ علمی دقائق خود اپنا ذہن پیش کرے اور اس ذہن کو کبھی بھی آگے نہ لایا جائے، بے نفسی اور فنا کا نہایت ہی اونچا مقام ہے اور یہ اسی کو میسّر آسکتا ہے جس نے نفسانیت کو کچل کر دکھ رہا ہو اور کسرِ نفسی اور تواضع اس کے رگ و پے میں سما گئی ہو [ورنہ آج کل تو' احقر الناس اور احقر الزمن کی رایوں کا رواج عام ہے]۔

دنیا آپ کی نظر میں

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میرے خسر مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری اپنے زمانۂ طالبِ علمی میں چھوٹی مسجد میں حضرت مفتیِ اعظم قدس سرہ کے پاس ہی ایک حجرے میں رہتے تھے اور حضرت کی زندگی کے اکثر معمولات ان کی نگاہوں میں آتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں نے کبھی بھی حضرت ممدوح کو پیر پھیلا کر لیٹتے ہوئے یا سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ سکڑ کر اور گھٹنے پیٹ میں دے کر لیٹتے اور سوتے تھے۔ پہلے تو میں اسے اتفاقات پر محمول کرتا رہا، مگر جب مسلسل یہی طرزِ عمل دیکھا تو میں نے سمجھا کہ یہ اتفاقی بات نہیں بلکہ ارادی فعل ہے، تو ایک دن میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ

پیر پھیلا کر کبھی نہیں سوتے۔ فرمایا کہ ’دنیا پیر پھیلا کر سونے کی جگہ نہیں ہے، اس کا مقام قبر ہے، جہاں آدمی پیر پھیلا کر سوئے گا‘۔

سبحانہ اللہ! یہ کلام اُسی کی زبان سے ادا ہوسکتا ہے جسے ہر وقت آخرت مستحضر اور عظمتِ خداوندی اس کے دل پر محیط اور چھائی ہوئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں جو دنیا کی لذّت وعیش کو دل سے نکال چکا ہو اور صرف اللہ کے سچے وعدوں پر شوقِ آخرت کو اپنے دل ودماغ کا تکیہ بنائے ہوئے ہو۔ ایک دو دن ایسا کر لینا ممکن ہے لیکن اس پر عمر گزارنا استقامت کی نادر ترین مثال ہے۔

فنائیت اور انکساری

حضرت مفتیِ اعظم جب سبق پڑھاتے تو لفظ نہایت پھوکے پھوکے، گفتگو نہایت دھیمی دھیمی، تقریر نہایت معصومانہ، لفظ لفظ سے رحمت وشفقت برستی تھی۔ کلمے کلمے سے بھولا پن، معصومیت اور سادگی ٹپکتی تھی۔ گویا ان کے دل میں کسی وقت بھی یہ تصور نہ تھا کہ میں کوئی چیز ہوں یا درسِ قرآن وحدیث میرا کوئی عظیم کارنامہ ہے جو مجھ سے انجام پا رہا ہے، یا یہ سیکڑوں شاگردوں اور مستفیدوں کا حلقہ میری کسی عظیم مقبولیت کی نشانی ہے!

ان خیالات سے قلب خالی اور دماغ فارغ تھا۔ سوتے اور جاگتے میں جس ذات کو ہر وقت یہ تصور رہتا ہو کہ دنیا نہ آرام کرنے کی جگہ ہے نہ پیر پھیلانے کی، اس کے قلب میں یہ خود پسندی یا خود بینی کے خیالات کیا سما سکتے تھے۔ بہ ہر حال انھیں اس کا کبھی دھیان بھی نہیں آتا تھا کہ میں کوئی بڑی شخصیت ہوں یا مجھ سے علم وعمل کی کوئی بڑی خدمت انجام پا رہی ہے، بلکہ ہر وقت جس چیز کا دھیان رہتا تھا، وہ یہ تھا کہ نہ کوئی چیز ہوں، نہ میری کوئی شخصیت ہے، نہ مجھ سے

کوئی خدمت بن پڑ رہی ہے۔ میں بھی من جملہ عام مسلمانوں کے ایک مسلمان ہوں اور یہ تمام علمی وعملی خدمات میرے کسی جوہر کا نتیجہ نہیں، بلکہ صرف فضلِ خداوندی ہے، جو کام کررہا ہے۔ اسے مجھ جیسے ہزاروں بندے مل سکتے ہیں، میں اس کے بندوں میں لاشئ محض ہوں۔

اللہ اکبر! سب کچھ کرکے یہ یقین رکھنا کہ کچھ نہیں ہوں، بڑوں ہی کا کام ہے اور بڑا ہی مقام ہے۔ ملائکہ جیسی مقدس ہستیوں کا یہ مقام ہوگا کہ کمالِ معرفت کے باوجود قیامت کے دن پکارتے ہوں گے:

ماعرفناک حقّ معرفتک۔

اے پروردگار! ہم تجھے کما حقہ پہچان ہی نہ سکے کہ تیرا کوئی حق ادا کرتے۔

انبیا علیہم السلام جیسی مقدس ذوات کا یہ مقام ہے کہ عمر کا ایک ایک لمحہ خالص و مخلصانہ عبادت میں بسر کرکرے قیامت کے دن یہی کہتے ہوں گے:

ماعبدناک حق عبادتک۔

اے مالک! ہم تیری کوئی عبادت نہیں کرسکے کہ تیرا کوئی حقِ بندگی ادا ہوسکتا۔

اور پھر ان برگزیدہ ہستیوں کے نائب اور وارثانِ نبوت حضرت مفتیِ اعظم جیسی ہستیوں کا مقام ہوسکتا ہے کہ سب کچھ کرکے دل میں کچھ کرنے کا دھیان تک نہ لائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فنائیت و بےنفسی کی انتہا، ایک ایسی ممتاز شان ہے جو ایسے ہی مقدسین کو نصیب ہوسکتی ہے۔

غمِ آخرت

غمِ آخرت کا قلب پر تسلط یہ تھا کہ 'جلالین شریف' کے درس میں ایک دن خود ہی یہ

واقعہ ارشاد فرمایا کہ میں ایک شب سونے کے لیے لیٹا تو اچانک قلب میں یہ اشکال وارد ہوا کہ قرآنِ کریم نے تو یہ دعویٰ فرمایا ہے:

لیس للإنسان إلا ما سعىٰ-[9]

انسان کے کام اُسی کی سعی آئے گی۔

جس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آخرت میں کسی کے لیے غیر کی سعی کارآمد نہ ہوگی اور حدیثِ نبوی ﷺ میں ایصالِ ثواب کی ترغیب آئی ہے، جس سے تخفیفِ عذاب، رفعِ عقاب اور ترقیِ درجات کی صورتیں ممکن بتلائی گئی ہیں، نیز شفاعتِ انبیا و صُلحا، و شفاعتِ حفاظ و شہدا سے رفعِ عذاب اور نجات اور ترقیِ درجات کا وعدہ کیا گیا ہے، جس سے صاف نمایاں ہے کہ آخرت میں غیر کی سعی بھی کارآمد ہوگی۔ پس یہ آیت و روایت میں کھلا تعارض ہے۔ فرمایا کہ اس کا حل سوچتا رہا مگر ذہن میں نہ آیا، بالآخر سوچتے سوچتے یہ خوف قلب پر طاری ہوا کہ جب آیت و روایت میں یہ تعارض ذہن میں جاگزیں ہے اور حل ذہن میں نہیں ہے تو گویا اس آیت پر میرا ایمان سست اور مضمحل ہے اور اگر اس حالت میں موت آگئی تو میں قرآن کی ایک آیت میں خلجان اور رَیب کی سی کیفیت لے کر جاؤں گا اور ایسی حالت کے ساتھ حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گا کہ قرآن کے ایک حصّے پر میرا ایمان سست اور مضمحل ہوگا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ اور کیا اس خاتمے کو حسنِ خاتمہ کہا جا سکے گا؟ اس دھیان کے آتے ہی فکرِ آخرت اس شدت سے دامن گیر ہوا کہ میں اسی وقت چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور سیدھے گنگوہ کی راہ لی۔ مقصد یہ تھا کہ راتوں رات گنگوہ پہنچ کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ اشکال حل کروں کہ میرا ایمان صحیح ہو اور حسنِ خاتمہ کی توقع بندھے۔

حالاں کہ آپ پیدل چلنے کے عادی نہ تھے اور وہ بھی گنگوہ جیسے لمبے سفر کے- جو دیوبند سے بائیس کوس کے فاصلے پر ہے یعنی تقریباً تیس میل- اور وہ بھی رات کے وقت۔ لیکن جب کہ خوفِ آخرت نفس کا حال بن چکا تھا تو اس میں وساوس کی کہاں گنجائش تھی؟ اس جذبے سے عزم پیدا ہوا اور اسی عزمِ صادق سے اتنا لمبا سفر کرنے کے لیے اندھیری رات میں پیدل ہی چل کھڑے ہوئے۔ صبحِ صادق سے پہلے گنگوہ پہنچے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ تہجد کے لیے وضو فرما رہے تھے کہ حضرت مفتیِ اعظم نے سلام کیا۔ فرمایا: کون؟ عرض کیا کہ عزیز الرحمن۔ فرمایا: تم اس وقت کہاں؟ عرض کیا کہ حضرت ایک علمی اشکال لے کر حاضر ہوا ہوں، جس میں مبتلا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن تو نفعِ آخرت کو صرف اپنی ذاتی سعی میں منحصر بتلا رہا ہے، جس سے غیر کی سعی کے نافع ہونے کی نفی نکل رہی ہے، اور حدیث غیر کی سعی کو نافع اور مؤثر بتلا رہی ہے، جس میں نفعِ آخرت ذاتی سعی میں منحصر نہیں رہتا، جو صراحتاً قرآن کا معارضہ ہے، تو ذہن میں اس تعارض کا حل نہیں آتا۔ حضرت نے وضو کرتے ہوئے برجستہ فرمایا کہ آیت میں سعیِ ایمانی مراد ہے جو آخرت میں غیر کے کارآمد نہیں ہوسکتی کہ ایمان تو کسی کا ہو اور نجات کسی کو ہو جائے اور حدیث میں سعیِ عملی مراد ہے جو ایک کی دوسرے کے کام آسکتی ہے، اس لیے کوئی تعارض نہیں۔ فرمایا کہ ایک دم میری آنکھ سی کھل گئی، جیسے کوئی پردہ آنکھ کے سامنے سے اٹھ گیا ہو اور علم کا ایک عظیم دروازہ کھل گیا۔

[نوٹ: یہ ایک علمی مسئلہ ہے، جس کا حضرت گنگوہیؒ نے برجستہ جواب عنایت فرمایا اور جس کی تائید قدما کے اقوال سے ہوتی ہے۔ 'تفسیرِ کبیر' میں علامہ رازی فرماتے ہیں: والجواب منه ان الإنسان لم يسع في أن يكون له صدقة القريب بالإيمان لا يكون له صدقة

فلیس له إلا ما سعی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان خود ایمان لا کر یہ کوشش نہ کرے کہ اس کے اہلِ قرابت کا صدقہ اس کے کام آئے تو ان کا یہ صدقہ اس کے کام ہرگز نہ آئے گا، اس لیے کہ انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ (ایمان لا کر) کوشش کرے۔[10] اس کے حاشیے 'تفسیر ابو سعید' میں ہے: وأما شفاعة الأنبياء عليهم السلام، وإستغفار الملائكة عليهم السلام، ودعاء الأحياء للأموات وصدقتهم عنهم وغير ذلک مما يكاد يحصیٰ من الأمور النافعة للإنسان مع انها ليست من عمله قطعاً فحيث كان مناط منفعة كل منها عمله الذى هو الإيمان والصلاح ولم يكن شيىء منها نفع ما بدونه۔ بہ ہر حال! انبیا علیہم السلام کی شفاعت، ملائکہ علیہم السلام کا استغفار اور زندوں کی دعا اور صدقہ، میت کے لیے اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے امورِ نافعہ جن کا شمار ممکن نہیں، ان سب میں میت کا عمل دخل نہیں ہے، لیکن امورِ مذکورہ کے نافع ثابت ہونے کا مدار ایمان اور اس کی اصلاح پر ہے۔ اگر یہ چیزیں (ایمان اور اس کی درستگی) ہی نہ ہو تو کسی کی کوئی چیز تو کجا خود اپنا نیک عمل بھی کوئی نفع نہیں دے گا۔[11] ندیم احمد انصاری]

بہ ہر حال! علم کا جو دروازہ اس مفتیِ اعظم پر کھلا وہ تو ان ہی کی ذات جان سکتی تھی کہ اس دروازے کے اندر کیا کیا نوادرات پنہاں ہیں، غور کرنے کے قابل یہ عظیم جذبہ ہے کہ ایک جزوی مسئلے کے ایک علمی اشکال پر اس درجہ خوفِ آخرت کا قلب پر مسلط ہو جانا کہ چار پائی پر ایک لمحے کے لیے قرار نہ رہے اور 30 میل کے لمبے اور دشوار گذار سفر کی ٹھان لی جائے اور وہ سفر بھی راتوں رات ہی شروع کر دیا جائے [وہ بھی آج سے تقریباً سو سال پہلے کے زمانے میں] یہ عالمِ آخرت سے کس درجہ قلبی لگن اور دنیاے دنی اور اس کی راحت و

لذت سے کس قدر بے تعلقی اور استغنا کی نادر مثال ہے، جو اکابرِ سلف ہی کی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔

بہ ہر حال! علم اور افتا جیسے علمی مقام پر اتنا اونچا پہنچ کر بھی اپنے علم و منصب کی عظمت کا کوئی تصور ذہن میں نہ آنا کسرِ نفسی کا انتہائی مقام ہے۔ ان اونچے مقامات کے لیے اول تو آپ کی فطرتِ صالحہ ہی مستعد تھی، جس کو حق تعالیٰ نے ان احوال و مقامات کے لیے منتخب فرمالیا تھا، اوپر سے آپ کے مربیِ اعظم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتممِ ثانی دارالعلوم دیوبند کی مخصوص توجہات نے اس پر چار چاند لگا دیے تھے۔

فطری صلاحیتیں

چناں چہ منشی سعید احمد صاحب' حضرت اقدس کے علاتی بھائی فرماتے تھے کہ بچپن ہی سے حلم، تحمل، بردباری آپ کے نفس کا جوہر تھی، اگر کسی چیز کو جی چاہا اور والدہ نے نہ دی تو رونا چلانا نہیں، یا چپ ہو کر رہ جاتے یا اس شے سے محرومی پر بہت ہی دل کڑھتا تو کوٹھری میں اندر گھس کر کسی کونے میں منہ چھپا لیتے اور رو لیتے۔ لیکن چیخنا چلانا یا واویلا کرنا بچپن میں بھی کبھی نہیں دیکھا گیا، جو قلب کے فطری طور پر صالح اور ضابط ہونے کی علامت ہے۔ گویا آپ کو بچپن ہی سے مقامِ رفیع کے لیے تیار کیا جا رہا تھا اور آپ کی فطری صلاحیتیں خود ہی ان بلند مقامات کو مانگ رہی تھیں۔ چناں چہ حسبِ بیان محترم منشی سعید احمد صاحب عثمانی (برادر خورد حضرت مفتیِ اعظم) جب حضرت مفتیِ اعظم نے حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور ریاضت وسلوک کا راستہ اختیار فرمایا تو مزاج میں یک سوئی اور غناعن الخلق بڑھتا گیا۔ بیوی بچوں کی طرف سے التفات ہٹ گیا، خلوت گزینی، یک سوئی اور مخلوق سے انقطاع کی

کیفیات کا غلبہ ہوگیا، تو ان کے والد ماجد حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ سے عرض کیا کہ جس راہ پر آپ نے عزیز الرحمن سلمہٗ کو ڈالا ہے، اس کے اچھے اور مبارک ہونے میں تو کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا اور اسے چھڑایا بھی نہیں جا سکتا، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ عزیز الرحمن بیوی بچوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔ اس پر شیخ نے فرمایا کہ مولوی صاحب آپ کو اللہ نے اور بھی اولاد دی ہے اور آیندہ ہوگی بھی، اُنھیں آپ جس طرح اور جہاں چاہیں لگا دیں، اس ایک کو صرف اللہ ہی کے لیے چھوڑ دیں۔ اس پر والد نے خاموشی اختیار فرمائی۔

توجہ الی اللہ اور اس کے اثرات

اس حقیقت کا ظہور مستقبل میں ان مختلف رنگوں میں ہوا اور واقعات نے بتلایا کہ حقیقتاً ایک ذات جب اللہ ہی کے لیے مخصوص ہوگئی تھی تو اللہ بھی اس کے ساتھ ہوگیا، جس کے پاکیزہ آثار نمایاں ہوتے رہے اور ایک زندہ تاریخ بن گئی۔ اس توجہ الی اللہ اور توجہِ حق کے اثرات کفار اور حکام تک بھی قبول کرنے لگے۔

حضرت مفتی اعظم کے داماد بابو عبد اللطیف صاحب نے اس دور میں سرکاری ملازمت کے لیے درخواست دی۔ اس عہدے کے لیے امیدوار بھی کافی تعداد میں تھے۔ بابو صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے عرض کیا کہ اس جگہ کے لیے میں بھی امیدوار ہوں، مگر اتنے امیدوار کے ہوتے ہوئے نہ معلوم میں کامیاب ہوسکوں گا یا نہیں، دعا فرما دیں۔ اس زمانے میں مظفر نگر کا یوروپین کلکٹر 'مارش' نامی تھا، اسی کے یہاں سب امیدواروں کو انٹرویو کے لیے پیش ہونا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ مارش سے انٹرویو کے وقت

یہ کہہ دینا کہ میں مفتی عزیز الرحمن کا داماد ہوں۔ بابو صاحب کو حیرانی ہوئی کہ بھلا کلکٹر اور وہ بھی انگریز اور انگریزوں کے بھی اس ابتدائی دور کا کلکٹر جو ضلع کا تنہا مالک ہوتا تھا، اس پر 'مدرسۂ دیوبند' کے ایک مولوی کا اثر کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اس کا نام سنتے ہی جھک جائے گا اور ملازمت دے دے گا۔ بابو صاحب نے اسے حضرت مفتیِ اعظم کی سادگی پر محمول کر کے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انٹریو میں گئے اور کلکٹر سے یہ جملہ نہ کہا اور ناکامیاب ہو کر چلے آئے اور حضرت مفتی صاحب سے عرض کیا کہ میں تو کامیاب نہیں ہوا۔ فرمایا کہ تم نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں مفتی عزیز الرحمن کا داماد ہوں؟ کہا کہ نہیں، میں نے تو یہ نہیں کہا۔ فرمایا کہ اچھا اب جا کر کہہ دینا۔ اور زیادہ حیرت ہوئی کہ اب تو انٹرویو کا قصہ بھی نہیں رہا، اب اس بے محل سفارشی جملے سے کیا ہوگا؟ تاہم مارش کلکٹر کے پاس گئے اور کہا کہ انٹرویو میں مَیں بھی تھا اور میں مفتی عزیز الرحمن کا داماد ہوں۔ اس پر مارش متاثر ہوا اور اس عہدے پر انھیں کو مامور کر دیا۔ یہی وہ تعلق مع اللہ ہے جس سے ان اہل اللہ کو ملک القلوب کہا گیا ہے، جن کی حکومت قلوب پر ہوتی ہے اور حکام وسلاطین بھی ان کے اثرات قبول کرتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ان اللہ والوں کا نام لے دیا جانا مشکل معاملات کے لیے کافی حل ہوتا ہے۔

اسی انداز کا ایک اور واقعہ منشی سعید احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب کسی سفر کے لیے تیار ہوئے، گاڑی آخر شب میں جاتی تھی، اس لیے نمازِ عشاء کے بعد ہی اسٹیشن تشریف لے گئے۔ اس وقت دیوبند کے اسٹیشن پر کوئی مسجد بنی ہوئی نہیں تھی، مسجد کے نام سے ایک چبوترہ تھا، جس پر مسافر جا لیٹتے تھے۔ حضرت مفتیِ اعظم بھی اس پر جا کر بیٹھ گئے۔ ساتھ میں منشی سعید احمد صاحب اور بعض دوسرے اعزّہ بھی تھے۔ باہم کچھ بات چیت

بھی ہوتی رہی، پھر بعض نے نماز وتلاوت شروع کردی، جس میں کچھ آوازیں ذرا اونچی ہو گئیں تو اسٹیشن ماسٹر جو ہندو تھا اور متعصب بھی، جھلّا کر اپنے گھر میں سے نکلا اور بڑبڑاتا ہوا آکر ان حضرات کو کچھ سخت سست کہنے لگا کہ نہ سوتے ہیں نہ سونے دیتے ہیں، یہ کہاں کی نماز اور قرآن لگایا ہے کہ لوگوں کو پریشان کرنے چلے آئے، اور غصّے میں بھرا ہوا بولتا اور بکتا رہا۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اتنا فرمایا 'یہ اس لیے بول رہے ہیں کہ ہم نہیں بولتے'۔ خدا جانے اس جملے میں کیا تاثیر تھی کہ ٹھنڈا ہوکر اک دم ایسا گیا کہ نہ پھر بولا نہ لوٹا، اوران سب حضرات نے اس چبوترے پر رات بہ اطمینان بسر کی۔

اللہ والے اس قوتِ غنا ویقین کی طاقت سے جب تصرّفات کرتے ہیں-تو یہ تو ایک دنیوی بات تھی جو ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی- دنیا ہی میں رہتے ہوئے آخرت بھی سنورتی چلی جاتی ہے۔

والدِ محترم کا آخری وقت اور آپؒ کی توجہِ باطنی

منشی سعید احمد صاحب ممدوح ہی نے بیان فرمایا کہ جب حضرت مفتی صاحب کے والد ماجد مولانا فضل الرحمن صاحب کے انتقال کا دن آپہنچا تو گیارہ بارہ بجے کے قریب ان پر غیر معمولی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری ہوئی۔ حد درجے بے چین اور مضطرب تھے اور کسی کروٹ چین نہ تھا۔ یہ کسی کو بھی تصور نہ تھا کہ وقتِ آخر قریب آرہا ہے، تاہم اضطراب پر سارا گھر بے چین اور متاثر تھا۔

مولانا فضل الرحمن صاحب ساری اولاد میں حضرت مفتی صاحب کو بلا لفظ 'مولوی' کے کبھی خطاب نہیں فرماتے تھے۔ اس بے چینی میں بھی منشی سعید احمد صاحب سے فرمایا کہ

مولوی عزیز الرحمن کہاں ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ابھی تو یہیں تھے، شاید کھانا کھانے چلے گئے ہیں۔فرمایا: بلالاؤ۔وہ کہتے ہیں کہ میں بلانے گھر پہنچا اور والد کی بے چینی کا ذکر کیا اور یہ کہ آپ کو ابھی بلایا ہے۔حضرت مفتی صاحب کھانا کھانے بیٹھ چکے تھے، مگر بلاوے کا لفظ سنتے ہی اسی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے ساتھ چلے آئے۔والد نے دیکھ کر اب خطاب کیا تو لفظ 'مولوی' سے نہیں بلکہ صرف 'عزیز الرحمن' کہہ کر مخاطب بنایا اور فرمایا کہ عزیز الرحمن تو نے ابھی تک میرے لیے انگلی تک نہیں اٹھائی (شاید مطلب یہ تھا کہ دعا نہیں کی)۔اس پر حضرت مفتی صاحب بے حد نادم و شرم سار سے ہو گئے اور زبان سے کچھ عرض کرنے کے بہ جائے والد کی چارپائی سے مونڈھا ملا کر بیٹھ گئے اور سر پر رومال ڈال کر گردن جھکائی اور مراقب ہو گئے۔چند منٹ کے بعد ہی دیکھنے میں آیا کہ والد کے چہرے پر جو بے چینی اور بدحواسی تھی، وہ سکون و طمانیت سے بدلنے لگی اور آخر کار چہرے پر اس درجے بشاشت آئی کہ آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر بے اختیار ہنسنے لگے اور قہقہے لگاتے ہوئے اپنے صاحب زادوں؛ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولانا مطلوب الرحمن صاحب کو خطاب کیا کہ شبیر ذرا دیکھو تو یہ اوپر کیا ہے اور مطلوب دیکھ تو سہی یہ کیا ہے؟ اور چہرہ حد درجے منفرح اور بشاش تھا۔خوشی چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی اور حضرت مفتی صاحب برابر ان کی طرف متوجہ تھے۔اسی حالتِ بشاشت میں والد نے کلمۂ طیبہ پڑھا اور چند منٹ کے بعد روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اس واقعے سے حضرت ممدوح کے اس غیر معمولی تصرف اور توجہ کا پتہ چلتا ہے جو مخلوق کا بیڑا پار لگانے میں ان بزرگوں سے نمایاں ہوا ہے۔ان کے شیخ نے گویا آج ہی کے

دن کے لیے کہا تھا کہ ایک کو اللہ کے لیے چھوڑ دو! یہ اسی کے آثار تھے جو ہویدا ہوئے اور ہوتے رہے۔ ان تصرفات میں یہ کس قدر عجیب وغریب تصرف تھا جو بیٹے نے اپنے شفیق باپ کے لیے دکھلایا، جس کے تحت حق تعالیٰ نے نہ صرف ان کے والد کے کرب و بے چینی ہی کو سکون و بشاشت سے بدل دیا بلکہ حسنِ خاتمہ اور مقبولیت کے آثار بھی نمایاں کر کے دکھلا دیے۔ رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً

آثارِ نسبتِ باطنی

ان رفیع احوال کے ساتھ نظمِ شریعت کے ادب وتحفظ کا یہ عالَم تھا کہ حسبِ بیانِ دفتری نور الحق صاحب ایک عجیب وغریب صورت پیش آئی کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ کے والد ماجد کی قبر میں سے ہر جمعرات کو قرآن شریف کی تلاوت کی آواز سنائی دینے لگی، جس کا لوگوں میں چرچا شروع ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس قبر کے ارد گرد جمع ہونے لگے اور جم گھٹا شروع ہو گیا، ہر وقت لوگ گھیرے رہتے۔ اس کا قدرتی ثمرہ یہی ہوسکتا تھا کہ توجہ الی الخلق بڑھ جاتی اور توجہ الی اللہ گھٹ جاتی اور وہ توکل جو بہ صورتِ عبادت ہمہ وقت حق تعالیٰ کے سامنے نمایاں ہوتا قبر کے ساتھ لگ کر منقسم ہو جاتا، جیسا کہ اس قسم کی غیر معمولی صورتوں سے اس قسم کے نتائج برآمد ہوتے رہے ہیں اور بہت سی بدعات کا ظہور بھی ہوتا رہا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اسے محسوس فرمایا اور ایک دن اس قبر پر تشریف لے گئے۔ مقررہ وقت پر تلاوت کی آواز سنائی دی تو اسی وقت حضرت ممدوح نے فرمایا: کیوں لوگوں کو فتنے میں مبتلا کر رکھا ہے؟ اس جملے کا زبان سے نکلنا تھا کہ وہ آواز بند ہوگئی اور پھر کبھی سنائی نہیں دی۔

کیا ٹھکانا ہے اس تصرف کا جو زندوں سے گزر کر برزخ تک پہنچا ہوا ہو اور قبر والوں پر بھی مؤثر ہوتا ہو! گویا قبر والے برزخ میں بھی ان مربیانِ دین کے وعظ و پند اور تنبیہ کے شائق اور ان پر عمل درآمد کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ سبحان اللہ! ایسے اربابِ تصرف کی توجۂ تام بھلا دنیا والوں پر تو کیوں مؤثر نہ ہوگی، جب کہ ناسوتی زندگی میں دنیا ان کا وطن بھی ہوتی ہے اور ان سے جسمانی قرب و اتصال بھی رہتا ہے۔ اسی لیے دنیا میں ان کا فیضان دوست اور دشمن سب کے لیے یکساں ہوتا ہے، جس کی برکات سے اپنا اور پرایا کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ نسبتِ باطنی کے یہ روشن آثار اور تصرفات کبھی زبان کے راستے سے نمایاں ہوتے ہیں، جیسے وعظ و پند کے الفاظ کی راہ سے قلوب میں اثرات پہنچ جاتے ہیں اور کبھی ہمتِ باطنی اور توجہِ تام کے راستے سے یہ آثارِ فیض ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی نگاہ سے اور کبھی اور کسی ہیئتِ کذائی سے۔ غرض جیسا موقع ہوتا ہے، اسی کے مناسبِ حال یہ حضرات تصرفات کی صورت اختیار فرماتے ہیں اور نتائجِ مطلوبہ نمایاں ہوجاتے ہیں۔

دل جوئی و دل داری

1327ھ میں جب میں [حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ] پہلے حج سے واپس ہوا تو دار العلوم دیوبند کے طلبہ اسٹیشن پر لینے آئے، اس [مجمع] میں اکابر بھی شامل تھے۔ جمعیۃ الطلبہ نے کچھ خوب صورت جھنڈیاں بنا کر ان سے استقبال کیا۔ چوں کہ اب تک اپنے بڑوں کے خیر مقدموں اور بالخصوص عبادتِ حج سے واپسی کے وقت یہ رسمی صورت نظر سے نہیں گزری تھی، اس لیے طلبہ کی محبت کے باوجود یہ روش اس وقت کے ماحول میں دل پر شاق گزری اور بھاری محسوس ہوئی۔ دل میں آرہا تھا کہ ان رسمیات سے انھیں

روکوں۔ میری اس کیفیت کو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (جو اپنی بزرگانہ شفقت سے خود بھی اسٹیشن پر تشریف لائے تھے) اپنی فراستِ باطنی سے محسوس فرمالیا اور انھیں یہ خیال گذرا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ (احقر) اس ناگواری کا اظہار اس موقع پر کر جائے اور اس کا اثر طلبہ کے حوصلوں پر بھی برا پڑے اور ساتھ یہ برا اثر لوٹ کر اس (احقر) پر بھی پڑے۔ میں حضرت کی اس بزرگانہ شفقت و خیر خواہی اور ساتھ ہی دانائی کی کیفیت کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ کس خوبی اور خوب صورتی سے حضرت نے مجھے اس ناگوار صورت سے بچالیا۔ طلبہ سے تو یہ فرمایا کہ تم مسجد میں چلو ہم وہیں آتے ہیں۔ وہ تو اُدھر [چلے] گئے اور اِدھر حضرت مفتی صاحب نے میرے پاس پہنچ کر اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ 'بھائی! یہ محبت سے آئے ہیں، دو چار کلمات شکریے کے ان کے سامنے کہہ دینا، ان کا دل بڑھ جائے گا'۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی پر تنبہ ہوا، چناں چہ مسجد پہنچ کر حضرت ممدوح کی موجودگی میں' باجود یہ کہ بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر تعمیلاً للارشاد طلبہ کے سامنے تشکر کے جملے کہے، جس پر طلبہ بھی خوش ہو گئے اور جس برے اثر کے پڑنے کا مجھ پر حضرت کو احتمال تھا، میں بھی اس سے بچ گیا۔ اس بچاؤ اور سلجھاؤ پر جو حضرت ممدوح کو خوشی ہوئی جو محسوس ہو رہی تھی، وہ بیان سے باہر ہے۔ انھیں خوشی اس کی تھی کہ ان سب چھوٹوں کی بات بن گئی اور کسی کے لیے ناگواری کی صورت پیش نہیں آئی۔

اللہ اکبر! اپنے چھوٹوں کی دل داری، ان کے حقوق کی رعایت اور ان کی بات رکھنے کا خیال اکابر کا ایک طبعی حال تھا، جس میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نمایاں اور ممتاز تھے۔

حضرت ممدوح کی مربیانہ شان صرف اپنے چھوٹوں اور متوسلین ومسترشدین ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اپنے ہم عصروں اور پیر بھائیوں پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے تھے۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب کراچوی، حضرت مفتیِ اعظم کے پیر بھائی تھے، جو حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور ان کے خُلفاے مجازین میں سے تھے۔ صاحبِ تصرف بزرگ تھے۔ دیوبند تشریف لاتے اور حضرت مفتیِ اعظم کے پاس قیام کرتے تھے۔ ایک بار دیوبند آئے۔ دارالعلوم کے قریب ایک دودھ والے کی دوکان تھی، جس سے آں ممدوح کا کچھ معاملہ ہوا۔ اس سلسلے میں دکان دار نے ایک دن بدمعاملگی کے ساتھ مولانا سے کچھ بدکلامی کی اور ناموزوں کلمات کہے، جس پر مولانا کو غصہ آ گیا۔ صاحبِ تصرف تھے، اس کی دکان پر تیز نگاہ ڈالی تو اس کی دکان کا سارا سامان الٹ پلٹ ہو گیا، کچھ برتن گر گرا گئے، کچھ ٹوٹ گئے اور ساری دکان الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی، جس سے دکان دار تو ہیبت زدہ ہو کر دم بہ خود رہ گیا اور مولانا دکان کو درہم برہم کر کے قیام گاہ پر چلے آئے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنا تو مولانا محمد ابراہیم کا یہ طرزِ عمل سخت گراں گزرا اور فرمایا کہ مولانا آپ یہاں کیوں آئے ہیں، میرے پاس کیا رکھا ہے، ایک طالبِ علم آدمی ہوں، پڑھنے پڑھانے کا شغل ہے اور آپ ماشاءاللہ خود صاحبِ تصرف ہیں، پھر آپ کو کہیں آنے جانے کی کیا ضرورت ہے اور ہم جیسوں کے پاس ٹھہرنے کی آخر حاجت ہی کیا ہے، آپ کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ یہ باتیں ناگواری کے لہجے میں فرمائیں، گویا فہمائش کی اور بتلایا کہ اہل اللہ کو تصرف کی طاقت اس لیے نہیں دی جاتی کہ وہ مخلوقِ خدا سے انتقامی کارروائیاں عمل میں لائیں اور اپنے جذبات سے ان کی تخریب کرتے پھریں اور اپنے تصرفات کی

طاقت دکھاتے پھریں۔ اس پر مولانا ممدوں نادم ہوئے، توبہ کی اور یہاں سے جا کر اس دکان دار سے بھی معافی مانگی۔

مولانا طفیل احمد صاحب (جو سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں اور دارالعلوم دیوبند کے فُضلا میں سے تھے) نے فرمایا کہ میں نے حضرت مفتیِ اعظم قدس سرہٗ کی وفات کے بعد انھیں خواب میں دیکھا کہ حضرت ممدوح ایک نہایت ہی پُر فضا مقام پر ہیں اور نہایت بشاش اور بہترین حالات ومقامات میں ہیں۔ حسبِ عادت اخلاق وشفقت سے ملے اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھے [اور] فرمایا کہ 'یہ وقت حاضریِ دربار کا ہے، اس وقت ہم کو دیدار کرایا جاتا ہے، اس وقت مجھ کو وہاں جانا ہے' اور یہ کہہ کر تشریف لے گئے۔

تصرفاتِ باطنی کے چند واقعات

آپ کے تصرفات بعض اوقات نہایت کھلے ہوتے تھے، جسے صاحبِ معاملہ واضح طریقے پر محسوس کر لیتا تھا۔ منشی سعید احمد صاحب کا بیان ہے کہ گھر والوں میں سے کوئی بھی کسی قسم کی بے چینی میں مبتلا ہو جاتا یا کوئی بھی حادثہ پیش آجاتا اور مبتلا ہو کر اہلِ خانہ پریشان ہو جاتے، مگر جب بھی حضرت مفتی صاحب کے پاس جا کر اپنی سراسیمگی پیش کی جاتی اور ضیقِ قلب کا اظہار کیا جاتا تو چند ہی جملوں سے اس درجے اس کا ازالہ فرما دیتے تھے کہ لوگ جاتے تھے بے چینی لے کر اور واپس ہوتے تھے طمانیت و بشاشت لے کر۔

مولانا اشتیاق احمد صاحب ممدوح کا بیان ہے کہ میں ایک باطنی حالت میں مبتلا ہوا اور اگر وہ چند دن رہ جاتی تو میں سخت نقصان اور خسران میں مبتلا ہو جاتا۔ میں اسی حالت میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوا اور اپنی حالت پیش کی۔ فرمایا کہ 'یہ اسم

پڑھ لیا کرؤ۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت دعا فرما دیں، فرمایا: 'دعا تو کروں ہی گا [کذا] تم یہ پڑھ لیا کرؤ۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے وہ اسم پڑھا اور میری حالت رو بہ سکون ہوگئی اور وہ تمام کیفیات جو پریشان کُن تھیں، یک سر زائل ہوگئیں۔

مولانا ظہور احمد صاحب، مدرسِ دارالعلوم کا بیان ہے کہ حضرت مفتیِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کھلے کھلے تصرّفات سے اپنے علّاتی بھائی مولانا مطلوب الرحمن صاحب عثمانی کی بہت زیادہ دست گیری فرمائی اور متعدد مہلکوں سے انھیں اپنے تصرفات سے سنبھالا اور بچایا۔ دیوبند میں ایک زمانے میں ایک فتنہ جسے 'شعبدہ' کہنا چاہیے، 'احیاے موتیٰ' کا پیش آیا۔ بعض متصوفین نے مردہ پرندوں کو بہ ظاہر زندہ کرنے کی نمائش کی، جس میں مولوی صاحب ممدوح بھی مبتلا ہو گئے۔ حضرت مفتی صاحب کو معلوم ہوا تو اس صنعت گری کا پردہ چاک فرمایا اور مولوی صاحب کو اس مہلکے سے بچایا، جس سے ان کی حالت سنبھل گئی۔

بہرحال! اس قسم کے تصرفات کبھی کسی دنیوی معاملات میں ظاہر ہوتے، کبھی الجھے ہوئے مقامات سے نکال لے جانے کے سلسلے میں صادر ہوتے اور کبھی مدارجِ باطنی طے کرانے کے باب میں ظہور پذیر ہوتے اور بہ کثرت پیش آتے تھے۔ دارالعلوم کے مختلف اطراف کے طلبہ اور کارکنوں میں بہ کثرت لوگ حضرت ممدوح کے سلسلۂ بیعت میں شامل ہو کر صفاے قلب کی دولت کماتے تھے اور اس طرح آپ کا سلسلہ اطرافِ ہندوستان میں پھیلا۔

غرض علم و عمل اور حال و مقال میں حضرت ممدوح کی ہستی اکابر دارالعلوم میں ایک مایہ ناز ہستی تھی۔ اگر ان اکابر کی زندگی میں یہ خیال رہتا کہ یہ ہستیاں ایک دن ہم سے چھین لی جائیں گی اور اس خیال سے ان کے حالات قلم بند کرنے کی طرف دھیان دیا جاتا تو ان

بزرگوں کے قدم قدم پر استقامت و کرامت کی اتنی وارداتیں تھیں کہ ہم لوگ ان سے صفحے کے صفحے رنگ لیتے اور ایسے نادرۂ روزگار واقعات ہزاروں قلم بند کر لیتے، لیکن ان حضرات کی موجودگی میں کبھی یہ تصور ہی نہیں آتا تھا کہ ایک دن یہ نہیں ہوں گے اور ہم اس وقت کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے کہ ہم نے ان کے علمی اور عملی اُسووں کو کیوں نہ قلم بند کرلیا کہ ان کا نقشِ قدم قدم قدم پر ساتھ دیتا۔

وفات

حضرت ممدوح 1346ھ مطابق 1928ء میں دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوکر جامعہ اسلامیہ، ڈابھیل (سورت؍حال ضلع نوساری) چلے گئے۔ اوائل جمادی الاخریٰ 1347ھ میں ڈابھیل سے تشریف لائے اور راستے میں طبیعت علیل ہوئی اور 17 جمادی الاخریٰ 1347ھ میں انتقال کیا اور دارالعلوم کے قبرستان میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پہلو میں دفن ہوئے۔[12] یعنی آپؒ نے 17 جمادی الثانیہ 1347ھ مطابق یکم دسمبر 1928ء کی شب کے دو بجے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ 10 بجے دن میں احاطہ 'مولسری' دارالعلوم میں آپ کی نمازِ جنازہ حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ نے پڑھائی اور 11 بجے آپ دارالعلوم کے قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔ طاب اللہ ثراہ، وجعل الجنۃ مثواہ

فتاویٰ کی تعداد

بہ ہر حال! آپ کی ذات جامع اوصاف اور جامع علوم تھی۔ علم میں مزید وسعت و حذاقت اور گہرائی افتا کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کی طویل تعلیمی خدمت نے پیدا کر دی تھی۔

ذہانت و ذکاوت آپ کا خاندانی ورثہ تھی، اس لیے فقہیات اور تفقہ فی الدین میں آپ کا سربلند ہونا تعجب خیز نہ تھا۔ اخلاق کی سربلندی حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہ مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند کی صحبت و مجلس نشینی اور استفادے کا ثمرہ تھی اور اس طرح آپ علم و عمل، اخلاق و ملکات، معرفت و بصیرت اور فقاہت و درایت کی بے مثل شخصیتوں میں سے ایک بلند پایہ شخصیت تھے، جن سے دارالعلوم دیوبند کے دارالافتا کو زینت بخشی گئی۔

افسوس ہے کہ آپ کے لکھے ہوئے تمام فتاویٰ کا مکمل ریکارڈ دست یاب نہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دارالافتا کے ابتدائی دور میں ریکارڈ اور ذخیرہ رکھنے کا کوئی خاص دستور نہ تھا، چناں چہ 1310ھ سے 21 ذی قعدہ 1329ھ تک کا کوئی ریکارڈ دفترِ افتا میں موجود نہ ہونا اس کی واضح دلیل ہے۔ اس کے بعد نقلِ فتاویٰ کی طرف توجہ ضرور ہوئی مگر ریکارڈ اور دفتری طور پر ذخیرے کے تحفظ کی طرف پھر بھی خاص توجہ نہیں پائی گئی، چناں چہ 1330ھ سے 1346ھ تک کی درمیانی مدت میں بعض سال کے رجسٹرِ نقولِ فتاویٰ دست یاب نہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عالمِ وجود ہی میں نہیں آئے یا محفوظ نہیں رہے اور ایسا کیوں ہوا؟ البتہ ان بعض سنین کے علاوہ 1330ھ سے 1346ھ تک حضرت مفتیِ اعظم کے تحریر فرمودہ فتاویٰ کا جو مکمل ریکارڈ دفترِ افتا میں موجود ہے، اس میں 37561 کی تعداد میں فتاویٰ بہ تفصیل ذیل مرقوم ہیں۔

حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحبؒ (مرتبِ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) کی اطلاع کے مطابق یہ تعداد مستفتی حضرات کے اعتبار سے ہے یعنی اتنے لفافے اور کارڈ

موصول ہوئے۔ باقی کوئی لفافہ یا کارڈ ایسا نہیں ہوتا جس میں متعدد سوالات نہ ہوتے ہوں، الا ماشاء اللہ۔ اگر اوسطاً ہر لفافے میں تین سوالات بھی مان لیے جائیں تو یہ تعداد ایک لاکھ بارہ ہزار چھے سو تراسی ہو جاتی ہے۔

تفصیل تعدادِ فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ، مفتیِ اعظم دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کی تفصیل از 22 ذی قعدہ 1329ھ تا 8 رجب 1346ھ، 15 سال 8 ماہ۔

سنہ	تعدادِ فتاویٰ
از 22 ذی قعدہ 1329 تا آخر	302
1330ھ	1719
از 14 رجب تا ختم 1332	845
1333ھ	2068
1334ھ	1943
1335ھ	1944
1336ھ	2126
1337ھ	2863
1338ھ	2348
1339ھ	2998

1340ھ	2950
1341ھ	2892
1342ھ	3201
1343ھ تا 13 ذی قعدہ	2886
از 2 صفر 1344ھ تا آخر سال	1070
1345ھ	3636
1346ھ 8 رجب تک	1721
میزان	**37561**

حضرت مرحوم کے یہ صرف پندرہ سالہ فتاویٰ کی تعداد ہے، جو بہ ذیل ریکارڈ محفوظ ہے۔ افسوس کہ 22 سالہ خدمت کا ذخیرہ سطحِ کاغذ پر نہیں ملتا۔ اگر اسی تناسب سے' جو نقشۂ بالا سے واضح ہے، چالیس سال کا ایک سرسری اندازہ لگایا جائے تو کم وبیش ایک لاکھ اٹھارہ ہزار فتاویٰ ہونے چاہئیں، جو حضرت کے قلمِ مبارک سے صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہوئے ہیں اور ایک جلیل القدر مفتی کے فضائل ومناقب کے لیے یہ کہہ دینا کافی فضیلت اور ممتاز منقبت ہے کہ انھوں نے ایک لاکھ اٹھارہ ہزار مقبول فتاویٰ سے عالمِ اسلامی کے ایمان واسلام کے تحفظ کی خدمت کی، جن میں سیکڑوں فتاویٰ محاکے اور فیصلے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔[13]

طرزِ افتا

آپ کا اندازِ فکر سلجھا ہوا، صاف ستھرا اور پختہ تھا۔ کہیں کسی مسئلے میں آپ تذبذب

کی راہ اختیار نہیں کرتے، بلکہ مسائل کی تہہ تک جاتے ہیں اور جو جوابات تحریر فرماتے ہیں، وہ ہر پہلو سے ٹھوس اور مکمل ہیں۔ کمال یہ ہے کہ دماغ و حافظہ کبھی خیانت نہیں کرتا۔ ذہن جب جاتا ہے تو صحت ہی کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ جوابات بے جا طول اور تکلیف دہ اختصار سے پاک ہیں۔ اندازِ بیان سلیس اور جامع۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی آسانی کے ساتھ آپ کا جواب سمجھ لیتا ہے۔ کسی کو کوئی الجھن پیش نہیں آتی۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کا کمال یہ ہے کہ عرفِ زمانہ سے کبھی صَرفِ نظر نہیں کرتے بلکہ اس پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگر کسی مسئلے کے دو پہلو ہیں تو ایسے موقع پر آپ سہل پہلو کو اختیار کرتے ہیں اور اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔ ایسی صورت ہرگز اختیار نہیں کرتے جو عوام کے لیے مشکلات پیدا کرنے والی ہو۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ آپ نے کنویں کی پاکی کے سلسلے میں تین سو ڈول نکالنے والی صورت پر فتویٰ دیا ہے۔ اسی طرح غیر ممالک سے تجارت میں بینک کا سود جو مجبوراً ادا کرنا پڑتا ہے اور اس کے بغیر تجارت ممکن نہیں، اسے اصل قیمت میں داخل کر کے تجارت کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ حرام قرار دے کر مسلمانوں کو اس طرح کی تجارت سے محروم نہیں کیا۔

اسی طرح ان کارخانوں میں جن کے اندر عام داخلے کی اجازت نہیں ہوتی، جمعے کی نماز کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، دوسرے لوگوں کی طرح 'اذنِ عام' کے پیشِ نظر عدمِ جواز کا فتویٰ نہیں دیتے بلکہ ثابت کرتے ہیں کہ داخلے کے ممنوع ہونے کی وجہ دوسری ہے۔ پھر جب تعددِ جمعہ پر عمل ہے تو اذنِ عام کی شرط کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں رہ جاتی اور شامی کی لمبی عبارت حوالے میں درج کرتے ہیں۔

آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ سوال پڑھ کر پہلے سائل کی حیثیت ذہن میں قائم کرتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق جواب تحریر فرماتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے متعدد سوالات میں آپ پڑھیں گے کہ کوئی مختصر ہے، جس میں صرف حکم بیان کر دیا گیا ہے اور کوئی مفصّل، جس میں پوری علمی بحث ہے اور حدیث وفقہ کے متعدد حوالے۔ یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ سائلین کے درجے مختلف ہیں۔ عوام کے لیے حکم بتا دینا ہی کافی ہے، مگر علما کے لیے دلائل کا فراہم کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح فتویٰ ہمیشہ مفتیٰ بہ قول پر دیا کرتے، بڑے سے بڑا عالم بھی اس کے خلاف اپنا رجحان ظاہر کرتا تو اس کی پروا نہیں کرتے۔ جیسے تشہد میں 'اشارہ بالسبابہ' کا مسئلہ۔ اس میں حضرت مجددِ الفِ ثانی نے مکتوبات میں عدمِ جواز لکھا ہے، مگر اسے آپ تسلیم نہیں کرتے اور مجدد صاحب قدس سرہ کے قول کی توجیہ کرتے ہیں یا بعض سوال میں کوئی مستفتی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نام لے کر لکھتا ہے کہ انھوں نے ایسا لکھا ہے، آپ جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں۔ یا اسی طرح تراویح میں ابن الہمامؒ کے رجحان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

اگر کوئی کسی حکم کی علت دریافت کرتا ہے اور وہ عوام میں سے ہے تو اسے صرف اتنا کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں کہ خدا و رسول کا ایسا ہی حکم ہے، لیکن اگر کوئی عالم پوچھتا ہے تو اسے علمی انداز میں حکم کی روح سمجھانے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی حال حوالے کا ہے کہ اگر وہ عام مشہور مسئلہ ہے یا کوئی عام شخص پوچھتا ہے تو حوالہ نہیں درج کرتے، ورنہ جگہ جگہ حوالہ بھی درج کرتے ہیں۔ اکثر آپ کے پیشِ نظر درمختار اور شامی ہے۔[14]

ترجمۂ جلالین ومعالم التنزیل

حضرت مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں ایک زمانے تک 'جلالین' کا درس دیا ہے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور فقیہِ ملت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ عثمانی جیسے مشاہیر اہلِ علم نے جلالین شریف آپ سے پڑھی اور کم لوگ جانتے ہیں کہ حضرت ممدوح نے اس مکمل تفسیر کو اردو میں بھی منتقل کیا، جسے اہتمام کے ساتھ آپ کے پوتے مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

1412ھ میں رمضان سے کچھ پہلے مالیر کوٹلہ کی 'عارفہ مسجد' میں بڑے سائز کا ایک قرآن مجید ملا، جس کے حاشیے پر تفسیرِ جلالین کا اردو ترجمہ دادا صاحب کا کیا ہوا چھپا ہے۔ یہ قرآن مجید ایک فٹ پانچ انچ لمبائی اور دس انچ چوڑائی میں پندرہ پندرہ پاروں کی دو جلدوں میں ہے۔ قرآن مجید کا متن نہایت جلی روشن اور نفیس خط میں ہے، اس کے نیچے دو ترجمے ہیں۔ پہلا ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا اور دوسرا ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ہے۔ حاشیے پر ترچھی لکھائی میں ایک طرف تفسیرِ حسینی دوسری طرف جلالین کا اردو ترجمہ ہے۔ دونوں جلدوں کے کل صفحات 1266 ہیں، جو مطبع ریاض، ہند، اکبر آباد سے محمد عنایت خاں کے زیرِ اہتمام 1314ھ میں یعنی حضرت مفتی اعظم کی انتالیس سال کی عمر میں شائع ہوا ہے۔ آخری صفحے پر تحریر ہے:

مہر و دستخط

مترجم تفسیرِ جلالین شریف، العبد عزیز الرحمن الدیوبندی، کان اللہ لہ، المدرس المفتی فی مدرسۃ الدیوبندیۃ۔

اس کے ساتھ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی اس طرح تصدیق ہے:

یہ ترجمہ جہاں تک بندے نے دیکھا صحیح پایا، واقعی مترجم نے نہایت محنت وجاں فشانی سے یہ ترجمہ کیا ہے۔حق تعالیٰ جزائے خیر دیوے اور اس ترجمے کو قبول فرماوے،فقط۔

العبد محمود حسن عفی عنہ مدرسِ اول، مدرسہ عربیہ اسلامیہ دیوبند۔

نیز مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی کا بیان ہے:

داداصاحب نے تفسیر ’معالم التنزیل‘ کا ملخص اردو ترجمہ بھی فرمایا تھا اور وہ مطبع باغ کلام نور، آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ تائے ابّا حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کی لائبریری ’ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی‘ میں موجود ہے۔[15]

❑❑❑❑

حوالہ جات

[1] قاسم العلوم:1/206،مرتبہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی

[2] تفسیرِ عثمانی:1/9،مرتبہ مولانا ولی رازی

[3] تاریخ دارالعلوم دیوبند:1/125،مصنفہ مولانا سید محبوب رضوی

[4] تذکرہ وسوانح علامہ شبیر احمد عثمانی:12،مدیر مولانا عبدالقیوم حقانی

[5] عزیز الفتاویٰ:77،مرتبہ مفتی محمد شفیع عثمانی

[6] تذکرہ وسوانح علامہ شبیر احمد عثمانی:12،مدیر مولانا عبدالقیوم حقانی

[7] عزیز الفتاویٰ:78،مرتبہ مفتی محمد شفیع عثمانی

[8] عزیز الفتاویٰ:78،مرتبہ مفتی محمد شفیع عثمانی

[9] النجم:۳۹

[10] تفسیر کبیر:۷/۶۸ ۷ للامام رازی

[11] تفسیر کبیر:۷/۶۸ ۷ للامام رازی

[12] تذکرہ وسوانح علامہ شبیر احمد عثمانی:13،مدیر مولانا عبدالقیوم حقانی

[13] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:58-1/36 بترمیم،مرتبہ مفتی ظفیر الدین مفتاحی

[14] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:123-1/121 بترمیم،مرتبہ مفتی ظفیر الدین مفتاحی

[15] روح القرآن:5-1/4 ملخصاً بترمیم،مرتبہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی

❑❑❑❑

شعرِ فقیہ

تاریخِ ادب کے گُم شدہ اوراق کی بازیافت

دینی مدارس سے وابستہ علمائے کرام خصوصاً مفتیانِ عظام کے تعلق سے عموماً یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ان میں حسِ لطیف کی کمی ہوتی ہے اور شعر گوئی تو کُجا شعر فہمی سے بھی وہ چار پتھر دور ہی ہوتے ہیں۔ مگر اسماعیل یوسف کالج، ممبئی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے ندیم احمد انصاری سے، جو ایک عالمِ دین ہونے کے علاوہ ممبئی یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ بھی کر رہے ہیں، اس تاثر کی حقیقت دریافت کریں تو وہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ مفتیانِ کرام کی اُردو شاعری پر لکھے ہوئے مقالات پر مشتمل اپنی مرتبہ کتاب 'شعرِ فقیہ' آپ کی خدمت میں پیش کر کے اس غلط فہمی کا مکمل ازالہ فرما دیں گے۔

اس کتاب میں انیس مفتیانِ کرام کی مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل شعری کاوشات پر طویل و مختصر مضامین شامل ہیں، جن میں سے آٹھ مضامین خود مرتب ندیم احمد انصاری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے نہ صرف تاریخِ ادب کے گُم شدہ اوراق کی بازیافت میں محنت کی ہے بلکہ شعرا کے حالات کی تلاش کا بھی حق ادا کیا ہے اور ان کے تذکرے سے اس کتاب کو مزید باوقار بنایا ہے۔ حمد و نعت، قصیدہ و مرثیہ، مثنوی و غزل، رباعی و قطعہ جیسی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرنے اور تصوف و معرفت کے ساتھ قلبی واردات اور دنیوی معاملات کو بھی قالبِ شعر میں ڈھالنے والے علمائے دین کو اُردو کی شعری روایت کا اٹوٹ حصہ بنانے میں

'شعرِ فقیہ' کو فقید المثال کامیابی ملے، اس دعا کے ساتھ میں اس علمی و ادبی خدمت کے لیے ندیم احمد انصاری صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر یونس اگاسکر
۲۲/نومبر ۲۰۱۹ء

❑❑❑❑

اس کتاب میں دار العلوم دیو بند سے وابستہ بعض ایسے علماے کرام اور ان کی اردو شاعری کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے کسی نہ کسی دور میں باقاعدہ کسی دار الافتا سے وابستہ رہ کر فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دی یا کم از کم افتا کی مشق کی ہو، اور ساتھ ہی ساتھ شعر وسخن میں بھی طبع آزمائی کی ہو۔ کتاب میں شامل اکثر مضامین دیگر حضرات کے تحریر کردہ ہیں، جنھیں مؤلف نے سالہا سال کی ان تھک محنت اور تگ و دو سے حاصل کر کے جمع اور مرتّب کیا ہے۔ جن حضرات کی شاعری کا تذکرہ کتاب میں پیش کیا گیا ہے، ان کی فہرست حسبِ ذیل ہے: (۱) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۲) مولانا اشرف علی تھانوی (۳) مفتی کفایت اللہ دہلوی (۴) مولانا اعزاز علی اعزازؔ امروہوی (۵) مفتی محمد شفیع عثمانی (۶) مفتی سید مہدی حسن آزاد (۷) مفتی محمود حسن گنگوہی (۸) مفتی جمیل احمد تھانوی (۹) مفتی نسیم احمد فریدی (۱۰) مفتی حفیظ الرحمن واصفؔ دہلوی (۱۱) مفتی کفیل الرحمن نشاطؔ (۱۲) مفتی عبد القدوس رومیؔ (۱۳) مفتی سید نظام الدین (۱۴) مفتی محمد تقی عثمانی (۱۵) مفتی رضاء الحق رضاؔ (۱۶) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (۱۷) مفتی محمد یوسف تاؤلوی (۱۸) مفتی عزیز الرحمن فتحپوری شہیدؔ (۱۹) مفتی شعیب اللہ خان مفتاحی۔❑❑



Book's Name : Tazkira e Azeez
Editor : Nadeem Ahmed Ansari
email : nadeem@afif.in
Edition : First (December - 2019)

9 789353 964320